دعوتِ دین

انفرادی زندگی، عائلی اصلاح اور قریبی ماحول

ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی اگرچہ ایک ماہر معاشیات کے طور پر متعارف ہیں اور معاشیات واقتصادیات کے حوالے سے ان کے افکار ونظریات اور دریافتوں کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے علمی وفکری موضوعات پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں، اس سے بھی ان کی علمی وفکری حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ ماہ نامہ ''زندگی نو'' کے اداریے اس کا بین ثبوت ہیں۔

زیر نظر کتاب ''دعوت دین'' ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی کا وہ مقالہ ہے، جو انہوں نے ماہ نامہ ''زندگی نو'' کے ماہِ مارچ ۲۰۰۱ء کے اداریے کے طور پر لکھا تھا۔ اسے زندگی نو کے اہل نظر قارئین نے نہ صرف غیر معمولی طور پر پسند کیا بلکہ اجتماعات اور خصوصی مجلسوں میں اس کی خواندگی کا بھی اہتمام کیا۔ موصوف نے اپنے اس مقالے میں ملت اسلامیہ کے فرزندوں اور خاص کر تحریک اسلامی کے کارکنوں کو مخاطب کر کے دعوت دین کی اہمیت وحقیقت کو اجاگر کیا ہے۔ اِس سلسلے میں خود احتسابی اور عزیمت کو انہوں نے خصوصی اہمیت دی ہے۔ وہ اپنے طویل مطالعے کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلام ایک دینِ عزیمت ہے اور یہ کہ اسلام اگرچہ کم زوروں اور طاقت وروں دونوں کو پناہ گاہ فراہم کرتا ہے تاہم راہِ حق میں رفعت وعظمت انہیں خوش قسمت لوگوں کا مقدر بنتی ہے، جو دین میں رخصت کی بہ جائے عزیمت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور یہ بھی کہ کسی کارکن کے اندر عزیمت کی کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب اُسے اپنے نصب العین سے والہانہ محبت ہو اور نصب العین سے محبت ووارفتگی کے لیے ضروری ہے کہ فرائضِ عبودیت کی ادائی کا خصوصی اہتمام کیا جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی کی زیر نظر کتاب نہ صرف تحریک اسلامی کے کارکنوں کی اصلاح وتربیت کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرے گی بلکہ اقامتِ دین کی مہم کو آگے بڑھانے میں بھی مہمیز ثابت ہوگی۔

دعوت و تربیت

دعوت حق کے طویل سفر کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی پیش آتا ہے، جب مخاطب بستیوں اور افراد کی طرف سے مایوسی طاری ہونے لگتی ہے۔ کارکنان دعوت سوچنے لگتے ہیں کہ زمین بڑی سنگلاخ ہے اور حالات نہایت صبر آزما ہیں۔ اور یہ بھی کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دعوت حق کی کھیتی کیسے پروان چڑھے گی؟

مایوسی اور بے زاری کے ان جذبات کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ ان میں کچھ کا تعلق خارج سے ہو سکتا ہے اور کچھ کا سلسلہ دراز ہو کر داخل کی کیفیات تک پہنچتا ہے۔ ان دونوں قسم کے اسباب کا ادراک اور ان کا تجزیہ ضروری ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تحفظ دعوت اور توسیع دعوت کے بظاہر متضاد تقاضوں کے درمیان ہم اس ضرورت سے یکسر غافل نہیں رہے ہیں۔ اگرچہ خارجی حالات پر ہماری توجہ زیادہ مرکوز رہی ہے، تاہم تحریک اسلامی کے بیدار مغز قائدین نے خود احتسابی کا دروازہ بھی کھولنے کی کوشش کی ہے۔

دعوت و تربیت کا ایک فطری اور تدریجی طریق کار ہے جو ہم کو قرآن کریم اور سنت رسولؐ سے ملتا ہے، بسا اوقات جوش دعوت میں ہم اس کو نظر انداز کرنے کی غلطی کر جاتے ہیں اور جب اس جوش دعوت کو وہ مقبولیت نہیں ملتی، جس کی داعی تمنا کرتا ہے، تو اس پر تھکن اور مایوسی کے جذبات طاری ہونے لگتے ہیں۔ وہ اس ناکامی کے اسباب، خارجی حالات میں تلاش کرتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ خود پر نظر ڈالنے کی بہ جائے حالات زمانہ کی سنگینی اور مخاطب کی بدبختی و کم نظری کو مجرم گردانتا ہے۔ مایوسی

کے ان لمحات میں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ تغیر احوال کا وہ مکلّف نہیں ہے۔ اس کی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ وہ بہ احسن وجوہ اور پورے انہماک سے اس تغیر کے لیے سرگرم عمل رہے اور اپنے کردار کو قبول دعوت میں حائل نہ ہونے دے۔ وہ نتائج کو مُصَرِّفُ القلوب کے حوالے کردے اور جو کچھ اس کے بس میں ہو، اسے کرے۔

اپنی اصلاح و تربیت:

دعوت و تربیت کا اولین میدان کارداعی کی اپنی شخصیت اور ذاتی کردار ہوتا ہے۔ وہ مخاطب تو تمام انسانوں کو کرتا ہے۔ اس لیے کہ بندگیٔ رب کا پیغام تمام انسانوں کے لیے نفع بخش ہے، لیکن اس کو سب سے پہلے اپنی فکر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اپنی اصلاح سب سے مشکل کام ہے۔ انسان کا نفس مسلسل اس کو آمادہ کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنی کوتاہیوں کو یا تو نظر انداز کردے یا ان پر خوش نما دلیلوں اور بہانوں کے پردے ڈال دے۔ ہمارے اندر ایسے فریب زدہ لوگ بہ کثرت پائے جاتے ہیں، جو حوصلے کی کمی اور جدوجہد کی سردی کے لیے دوسروں کو ذمّے دار ٹھیراتے ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہم تو بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے ساتھی کوتاہ عمل ہیں، بے بصیرت ہیں، اور وہ دنیوی مشغلوں میں غرق ہیں۔ کبھی یہ سننے میں آتا ہے کہ عزیمت اور ایثار پسندی اوپر سے آتی ہے، لیکن اب ایسے رہنما کہاں رہ گئے؟ اب جو لوگ ہمارے قائد بن بیٹھے ہیں، ان میں وہ خوے دلنوازی کہاں جو خرمن دل میں آگ لگادیتی ہے! کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ فرائض اور ذمے داریوں سے غفلت ہمارے رفقاے سفر کا شعار بن گئی ہے۔ یہ وہ چند بہانے ہیں جن کو پیش کرتے وقت بعض تحریکی ساتھی پوری چرب زبانی سے کام لیتے ہیں۔ انفرادی گفتگوؤں اور مجلسوں میں اس طرح کے عذر تراش کر یہ لوگ بزعم خود اپنی ذمّے داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

اسلام ایک دین عزیمت:

اگر اس طلاقت لسانی سے متاثر ہو کر آپ ان افراد کی تلاش شروع کردیں، جن پر

یہ الزامات صادق آسکتے ہیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کہنے والے خود ہی ان میں مبتلا ہیں۔
اسلام اصلاً دین عزیمت ہے۔وہ کمزوروں کے لیے بھی پناہ گاہ فراہم کرتا ہے، لیکن رفعت مراتب ان کا مقدر ہوتی ہے، جو عزیمت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔تحریک اسلامی اور دعوت حق تو بدرجہ اولیٰ عزیمت کی راہ ہے، وہ دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے کا حوصلہ سکھاتی ہے۔جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی تھی کہ وہ اس تحریک کا دامن تھام لے، اس نے ہوش وحواس کی سلامتی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ راہ عزیمت اختیار کرے گا۔انبیاء علیہم السلام، تمام کے تمام داعیانِ حق تھے۔اس لیے ان کی شان، شانِ عزیمت تھی۔قرآن کریم اس پر شاہد ہے۔رسول آخر صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اس کی روشن دلیل ہے، قرآن کریم میں حکم ہے:

وَأُمِرْتُ أَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْن (الزمر:۱۲)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلم بنوں۔''

رسالت کے مرتبے پر فائز ہونے کے بعد یہ اعلان عزیمت کیا گیا کہ:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن (الانعام:۱۶۲)

''آپ کہہ دیجیے کہ میری نماز، میری عبادتیں، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔''

عزیمت کے اس مقام کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ رب العزت نے اپنے محبوب بندے کو بار بار صبر کی تلقین کی اور یہ تسلی دلائی کہ ہم وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے ہیں جو دشمن تمھیں کہتے ہیں اور جس ظلم وستم کے تم شکار ہو، وہ ہماری نظر میں ہے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (الطور:۴۸)

''اور آپ اپنے رب کے اس حکم پر صبر کیجیے اس لیے کہ آپ ہماری نگاہ میں ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس مقام عزیمت پر خداوند کریم رکھنا چاہتا تھا، اس کا اندازہ اس ارشاد سے بخوبی ہوسکتا ہے:

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا۔ اِذًا لَّاَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَاتَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا۔ (بنی اسرائیل:۷۴-۷۵)

''اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدمی نہ بخشی ہوتی تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھک جاتے، (اگر ایسا ہوتا) تو ہم آپ کو حالت حیات میں اور موت کے بعد دوہرا عذاب چکھاتے۔ پھر آپ ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتے۔''

آپ کی شان عزیمت میں اللہ رب العزت کو ذرہ برابر بھی نقص گوارا نہ تھا کہ آپ جائز بشری جذبات کے تحت ایک حلال وطیب غذا سے مکمل احتراز فرمائیں، جیسا کہ سورہ تحریم کی ابتدائی آیات بتاتی ہیں۔ یا خالص دعوتی جذبات کی رو میں ایک نابینا صحابی کی ضرورت تزکیہ سے وقتی طور پر صرف نظر کرلیں۔ (سورہ عبس ۱۔۱۰)

آپؐ نے انسانوں کو یہ سبق سکھایا کہ دنیا کے سامان راحت، اللہ تعالیٰ کی عنایات کا مظہر ہیں۔ اور ان کا صحیح اور جائز استعمال اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری سے عبارت ہے۔ لیکن آپؐ کی شان عزیمت یہ تھی کہ کھجور کی چٹائی پر آرام کرتے تھے، روکھی پھیکی غذا پر اکتفا کرتے اور موٹے اور کھردرے لباس زیب تن فرماتے تھے۔ ایک زمانہ وہ آیا جب کہ آپؐ کے اشارہ چشم وابرو پر دنیا کی نعمتیں حاضر ہوسکتی تھیں۔ مگر آپؐ نے درویشی اور سادگی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

پھر ایک دور آپؐ پر ایسا بھی آیا تھا جب مکہ اور طائف کی جاں گداز پریشانیاں آپؐ پر گزر رہی تھیں۔ اس کے متعلق یہ حدیث سنیے:

عن أبی هريرةؓ قال: إن كان يمرّ بآل رسول الله الأهلة مايُسرجُ فی بيت أحد منهم سراج ولا يوقد فيه نار۔ إن وجدوا زيتا إدَّهنُوا به۔ (ترغیب وترہیب، جلد:۴)

''حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں پر کئی مہینے اس حال میں گزر جاتے کہ ان میں کسی کے یہاں چراغ نہ جلتا اور نہ آگ جلانے کی نوبت آتی۔ اگر زیتون کا تیل مل جاتا تو سر میں لگا لیتے۔''

دوسری حدیث اس زمانے کے متعلق سنیے جب آپ ﷺ کو اقتدار حاصل ہو چکا تھا:

عن ابن مسعودؓ: نام رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم علیٰ حصیر فقام وقد أثّر فی جنبه فقلنا: یا رسول اللّٰه! لو اتخذنا لك وطاً فقال: مالی وللدُّنیا؟ ما أنا فی الدنیا الا کراکب استظل تحت شجرة ثُمّ راح وترکها۔(ترمذی)

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی پر سوئے۔ جب آپؐ اٹھے تو چٹائی کے نشانات آپؐ کے پہلو میں ہم نے دیکھے، تو ہم نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! اگر ہم آپؐ کے لیے کوئی گدا بنا دیں تو کیسا رہے گا؟ آپؐ نے فرمایا: مجھے دنیا سے کیا مطلب؟ میں تو دنیا میں اس مسافر کی طرح ہوں، جس نے کسی درخت کے سائے میں کچھ دیر آرام کیا، پھر درخت، اور درخت کے سائے کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہوگیا۔''

یہ اس نبی محترمؐ کا شعار تھا، جس کی زبان سے قرآن نے یہ اعلان کیا تھا کہ رہبانیت انسان خود ساختہ بدعت ہے اور طیبات رزق، اللہ تعالیٰ کی عنایات ہیں، جن سے بچنے کا مالک کائنات نے حکم نہیں دیا ہے۔

عزیمت کی اس رفعت پر پہنچنا کمزور انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے، ہمارے لیے تو یہ حکم ہے:

اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّلِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔

''تم پر تمہاری جانوں کا حق ہے اور تمہارے گھر والوں کا حق ہے۔'' (الحدیث)

اور قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص:۷۷)

''جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔''

اسلامی تعلیمات کی شان امتیازی یہی ہے کہ اس نے حسن کا استعمال سکھایا ہے، ترک دنیا نہیں۔

لیکن تحریک اسلامی سے ہماری وابستگی اس عزم کا شعوری اظہار ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دکھائی ہوئی راہ عزیمت پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ زندگی کی متاع کو اس پر لگائیں گے۔ جو وقت اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اسے اس کی راہ میں صرف کریں گے۔ جو وسائل اس نے عنایت کیے ہیں، ہم اس کے دین پر حتی المقدور لٹائیں گے۔ اگر فقیر اور قلندر نہ بن سکے تو اس طرح کا ذہن و مزاج بنائیں گے جو ''تکاثر'' نہ کہلائے۔ چوں کہ ہم ''دین وسط'' کی تعلیمات کا مجمل شعور رکھتے تھے اس لیے دنیا کو لات مارنے کی غیر اسلامی روش ہم نے کبھی اختیار نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ دنیا طلبی سے بچنے کا عزم ہمارا زادِ راہ رہا۔ اب ہمارا حال کیا ہے؟ ہم عزیمت کی بجائے رخصت کے متلاشی ہیں۔ ہم نے تحفظات کی دنیا بنالی ہے۔ دوسروں کو الزام دیتے دیتے ہم خود غرق ہوتے جارہے ہیں۔ آج کی دنیا میں روزی کے حلال اور پاکیزہ ذرائع کم یاب ہیں۔ اس لیے ہم بھی فقہی اور قانونی موشگافیوں کا سہارا لینے لگے ہیں۔ بد قسمتی سے ہماری ملت میں ایسے فقیہوں کی کمی نہیں ہے، جو حدود اللہ کے آخری سرے پر پہنچانے میں ماہر ہیں۔ ہم میں کتنے ایسے ہیں جو احوال و ظروف کی تنگ ظرفی کا سہارا لے کر رفتہ رفتہ اوروں کے رنگ میں رنگتے جارہے ہیں۔

نصب العین سے محبت:

اپنے نصب العین سے محبت، بڑی جدوجہد سے نصیب ہوتی ہے، لیکن سہل انگاری اور رخصت پزیری متعدی امراض ہیں۔ دوسروں کی عیب جوئی کرتے کرتے ہم میں بھی وہ عیوب پیدا ہوجاتے ہیں۔ گندگیاں اچھالنے والا کبھی آلودگی سے نہیں بچ سکتا۔ اپنے رفقاے کار کی سستی تلاش کرتے کرتے ہم میں یہ رجحان پیدا ہوجاتا ہے کہ جب سب راہ عزیمت سے فرار اختیار کرچکے ہیں تو ہم کو کیا پڑی ہے کہ ہم تن تنہا محاذ پر ڈٹے رہیں۔ مگر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ رخصتوں پر عمل کرنے والا کردار دفعتاً یا بے وجہ پیدا نہیں ہوتا ہے۔

ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ بعضوں کی زندگیوں میں فرائض عبودیت سے غفلت، دعوتی جدوجہد میں مصروفیت اور انہماک کے بہانے پیدا ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اپنی سرگرمیوں

کے دوران نماز باجماعت کا وقت نہیں نکال پاتے اور کچھ اسلام کی علمی اور تحقیقی خدمات میں انہماک کے سبب اس میں کوتاہی برتتے ہیں بعض مہتم بالشان اسلامی کانفرنسوں میں یہ مشاہدہ خصوصیت کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ کچھ لوگ بزعم خود، دین حق کی ترجیحات بدلنے لگتے ہیں۔ بعض قابل قدر نوجوان عزیمت اور جہاد کا سبق دیتے دیتے پہلے سنن اور نوافل کی اہمیت کم کرتے ہیں۔ پھر فرض نمازوں کی ادائی سے غفلت برتنے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ شروع اس طرح کرتے ہیں کہ "تراویح غیر ضروری ہے" چناں چہ عشا کی چار رکعت فرض ادا کر کے مسجد سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ پھر رمضان المبارک کے مقدس ایام میں بھی جماعت کا اہتمام کرنے سے گریز کرنے لگتے ہیں۔

عبادات سے غفلت کا نتیجہ:

فرائض عبودیت بالخصوص نماز باجماعت کے اہتمام سے غفلت، اجتماعیت سے غفلت کا راستہ آسان کر دیتی ہے۔ اسی طرح نفلی عبادتوں کو غلط تصوف کہہ کر ڈسمس کرنا، ایک مہلک رجحان ہے۔ ابتداءً بعض سرگرم عمل ساتھیوں کے اندر یہ تردد پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے سست کار ہیں تو ہم کیوں سرگرم کار رہیں؟ بسا اوقات یہ محض بدگمانی پر مبنی ہوتا ہے۔ الحمدللہ، تحریک میں ایسے لوگوں کا فقدان نہیں ہے جو عمر کے آخری مرحلے تک بھی سرگرم عمل ہیں۔ لیکن ڈھلتی عمر، قویٰ کو مضمحل کر دیتی ہے۔ اس لیے اگر بوڑھے آگے نہیں بڑھتے تو ان کا بہانہ بنانا نوجوانوں اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔ پھر تحریکی سرگرمیوں کے متعدد میدان کار ہیں۔ ہر کام ہر شخص نہیں کر سکتا۔ اس لیے ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں اور اپنے رجحان کے مطابق میدان کار منتخب کرنا چاہیے۔ ان لوگوں کی ظاہری سستی کو اپنے لیے بہانہ نہیں بنانا چاہیے۔ یہ تردد بڑھتے بڑھتے جماعتی ذمہ داریوں سے فرار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ معمول کے اجتماعات سے غیر حاضری بھی ہونے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ ذاتی مصروفیات تحریکی ذمے داریوں پر ترجیح پانے لگتی ہیں۔ ایک اور راہ سے بھی یہ کمزوری در انداز ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ تحریک کی رفتار کار اور اس کے طریق کار سے پہلے غیر مطمئن ہوتے ہیں، پھر اس پر تنقید کرتے ہیں۔ جب ان کو گمان لاحق ہو جاتا ہے کہ ان کی

تنقید سے اصلاح نہیں ہوتی تو رخصت کو شیوۂ زندگی بنا لیتے ہیں۔ اور وہی سب کچھ اپنی زندگی میں گوارا کر لیتے ہیں جس پر وہ مضطرب تھے۔ ہمارے بعض رفقاء اپنے پہلے دور میں سرگرم عمل اور انفاق مال کے لحاظ سے اعلیٰ معیار پر فائز تھے۔ لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی ذاتی پسند کے مطابق کام نہیں ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی ان کے رفقائے کار کی بعض کوتاہیوں کا انہیں علم ہو گیا تو انہوں نے پہلے انفاق سے دست کشی اختیار کی، پھر خاموشی سے اصلاح حال کی بجائے برملا بے زاری کا اظہار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے ہم نشیں اور ان کے اہل خاندان سبھی تحریک سے بے زار ہو گئے اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ عزیمت پر قائم ہیں۔ یہ بھی عجیب رخصت ہے۔ جس کو آپ بزعم خود ''عزیمت'' کا نام دیتے ہیں۔

عزیمت کیا ہے؟

عزیمت اس امر کا نام ہے کہ جس نصب العین اور جس طریق کار کے لیے آپ نے اجتماعی زندگی اختیار کی ہے، اس پر ثبات قدمی اور ذہنی یک سوئی سے قائم رہیں۔ اگر تفصیلات پر آپ کو اطمینان نہیں ہے تو یہ خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ دوسرے لوگ بھی عقل اور استدلال سے بہرہ ور ہیں اور وہ بھی تحریک کے مخلص خادم ہیں۔ اختلافات تو فطری ہیں۔ جب اجتماعیت فیصلہ کر لے تو یہ سمجھنا چاہیے اور دعا بھی کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران:۱۵۹)

''اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو۔ جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اسے زیر عمل لاؤ اور اللہ پر بھروسا کرو''

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ کا رجحان اجتماعیت کے لیے سم قاتل ہے۔ ایک عظیم فقیہ نے بہترین رویے کی کیا خوب نشاندہی کی ہے:

رائیی صواب یحتمل الخطا ورأیك خطا یحتمل الصّواب۔

میری رائے صحیح ہے، جس میں خطا کا امکان ہے اور تمہاری رائے غلط ہے، جس میں صحیح ہونے کا امکان ہے۔''

اسی طرح ہمارے بعض سمجھ دار اور سرگرم عمل ساتھیوں کا طرز عمل اجتماعیت کے خلاف ہے، وہ کچھ دُور تحریک کا ساتھ دیتے ہیں اور کچھ دور دوسروں کا۔ انہیں اس نصب العین میں بھی کشش نظر آتی ہے اور دوسروں کے وقتی مقاصد میں بھی۔ وہ اگر اجتماعی فیصلوں کی بعض شقوں سے اختلاف کرتے ہیں تو صرف ان سے برملا اعلان برأت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ نیت پر بھی شبہ کرتے ہیں۔ یہ طرز عمل یا تو خودرائی کا نتیجہ ہوتا ہے یا نصب العین کے متعلق تذبذب اور تردد کا۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ ہر محفل کی رونق بننا وہی چیز ہے، جس کو ملت اسلامیہ اور ملک کے عمومی مفادات کے لیے دوسرے گروہوں کی تائید کرنا اور حسب مقدور ان سے تعاون کرنا کہا جاتا ہے، جو کہ تحریک کے پروگرام میں داخل ہے۔ مؤخرالذکر امر اجتماعی فیصلہ چاہتا ہے۔ کہاں کہاں دست تعاون بڑھانا چاہیے اور کس حد تک دوسروں کا ساتھ دینا چاہیے۔ یہ ہر فرد بشر کی ذاتی پسند پر منحصر نہیں ہوتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو انتشار فکر جنم لے گا اور اجتماعیت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ عزیمت استقامت چاہتی ہے، سرگردانی نہیں۔ مذکورہ رویہ تو رخصتوں کی آماجگاہ ہے۔ اپنے نصب العین سے تذبذب، کردار میں ایک ایسی کمزوری پیدا کر سکتا ہے جس سے فرد کو طلاقت لسانی سے بہکایا بھی جا سکتا ہے اور عز و جاہ کے لالچ کا شکار بھی بنایا جا سکتا ہے۔

تعمیری اختلافات

اس ضمن میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ صحت مند اور تعمیری اختلافات تحریکی پیش رفت کے ضامن ہیں۔ وہ کسی ایسی فکری یک رخی (Regimentation) کو صحیح نہیں سمجھتی، جس میں طریق کار اور ترجیحات عمل میں اختلاف گوارا نہ کیا جاتا ہو۔ اس طرح کے اختلافات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی رائے کے مطابق کوئی بھی فرد جس راستے پر چاہے چلے، اور جن ترجیحات کو بزعم خود وہ صحیح سمجھتا ہو، ان کے مطابق اپنی سرگرمیاں ترتیب دے۔ تحریکی فیصلوں کو ہم نے کبھی بھی حق و باطل کا معیار نہیں سمجھا ہے اور نہ بعض خود فریبی میں مبتلا گروہوں کی طرح تحریک اسلامی کو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی قرار دیا ہے، جس کے باہر

باطل ہی باطل ہے۔ البتہ ہم نے دو باتیں قرآن وسنت سے اخذ کی ہیں:

پہلی بات، ہمارا نصب العین ہے، جو درحقیقت تمام ملت کا نصب العین ہے اور ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اس نصب العین کے لیے اجتماعیت شرط لازم ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اجتماعی زندگی کے تقاضوں کو بھی قرآن وسنت سے اخذ کیا ہے۔ اب جس شخص کو ان بنیادوں پر اطمینان نہیں ہے اس کو فکر ونظر کے تردد میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنی پسندیدہ راہ اختیار کرنی چاہیے۔

جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریک اسلامی عزم وحوصلہ کی داستان لکھنے کی ایک حقیر لیکن مبارک کوشش ہے۔ اس کو کسی کم حوصلہ، پست ہمت، رخصتوں میں مبتلا، تزکیہ نفس سے غافل گروہ کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کو ایسے لوگوں کی بھی ضرورت نہیں ہے جن کی روش یہ ہو کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہبر کے ساتھ

اس تحریک کی اساس، تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوىٰ پر رکھی گئی ہے، شتر گربگی اس کی عین ضد ہے۔

استقامت اور عزیمت کی یہ شان ہمارے رہبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر مرحلے میں جھلکتی ہے۔ اس رفعت مقام پر پہنچنے کے لیے آپ کو رات کی نیندیں حرام کرنی پڑیں۔ فرض نمازوں کے ساتھ آپ کو تلقین کی گئی:

فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ، عَسٰىٓ اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ (بنی اسرائیل:۷۹)

''اور رات کے حصے میں تہجد پڑھا کیجیے جو آپ کے لیے زائد (عبادت) ہے۔ توقع ہے آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر پہنچائے گا۔''

آپ کو بتایا گیا کہ آپ رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزاریں۔ اس لیے کہ آپ کا رب آپ پر گراں بار ذمے داری ڈالنے والا ہے۔ (المزمل) چنانچہ آپ نماز میں اتنا طویل

قیام کرتے تھے کہ آپ کے پائے مبارک میں ورم آجاتا تھا۔اور جب آپ سے یہ کہا گیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف کردیئے تو آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ تو آپؐ نے جواب میں فرمایا:

أفلا أكون عبداً شكوراً؟

''کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں؟'' (بخاری عن المغیرہ بن شعبہ)

دعوت وتبلیغ کے سلسلے کی طویل داستان عزیمت جاننے کے لیے آپؐ کی سیرت کا وہ رخ دیکھیے کہ آپ ﷺ کو مشفقانہ ڈانٹ سننی پڑی کہ کیا آپؐ اس دعوت کے لیے اپنی جان ہی ہلکان کرڈالیں گے؟'' (الشعراء:۳)

عزیمت کی شان اس روایت سے بھی جھلکتی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک نبی کا حال بیان کررہے تھے۔وہ منظر میرے سامنے ہے۔آپؐ نے فرمایا: (دعوت الی اللہ کے جرم میں) قوم نے نبی کو اس قدر مارا کہ اس کا جسم خون سے لت پت ہوگیا۔اس نے اپنے چہرے سے خون پونچھتے ہوئے کہا: اے اللہ! میری قوم کو معاف فرمادے، وہ نہیں جانتی۔ (بخاری، کتاب الدنیا)

حضرات انبیاء علیہم السلام کا یہی اسوہ رہا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اپنے نفس پر توجہ کی کہ ان کو اس کا حکم دیا گیا تھا۔فکروعمل کی دورنگی سے ان کو دور کا واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اعلان بھی کیا اور اس طرزِ عمل کو اپنی زندگی کا شعار بھی بنالیا۔وہ قول و عمل کی ہم آہنگی میں اتنے محکم تھے کہ اس کو اپنی دعوت کی صداقت کے لیے دلیل محکم کے طور پر پیش کرتے تھے۔

وَمَآ أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَآ أَنْهَاكُمْ عَنْهُ (ہود:۸۸)

''اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے پیچھے ان کاموں کو کروں جن سے تم کو منع کرتا ہوں۔''

اور أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ کا ارشاد گرامی بھی اسی کا مظہر ہے۔

اپنے نفس کے بعد دعوت وتربیت کے دوسرے مخاطب انسان کے اپنے قریب ترین اعزہ ہیں۔سب سے پہلے اپنی اولاد، اپنی بیوی اور اپنے اہل خاندان ہیں۔

قرآن کریم میں اس فطری تربیت کوملحوظ رکھا گیا۔ چنانچہ فرمایا:

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا۔ (التحریم:٦)

''اے ایمان لانے والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو (جہنم کی) آگ سے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو دعائیں اس فطری تدریج کی مظہر ہیں:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَّاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ۔ (ابراہیم:۳۵)

''اور یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ نے دعا کی کہ اے رب! اس شہر کو امن والا بنادے اور مجھ کو اور میرے فرزندوں کو بتوں کی پرستش سے بچا۔''

دوسری جگہ آپ کی دعا کے الفاظ یہ ہیں:

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ۔ (ابراہیم:۴۰)

''پروردگار! مجھے اور میری ذریت کونماز قائم کرنے والا بنادے۔ اے ہمارے رب! ہماری یہ دعاء قبول کر۔

سورۃ الفرقان میں عباد الرحمٰن کی صفات بتاتے ہوئے ان کی یہ دعا نقل کی گئی ہے:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا۔ (الفرقان:۷۴)

''اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔''

اس دعا میں اولاد کے ساتھ بیوی کا بھی واضح ذکر ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک سے مراد ان کی پاکیزگی اور تقویٰ شعاری ہے، جس سے بندۂ مومن کی آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے، اور دل کو سکینت۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز کو وہ خود پسند کرتا ہے، اس سے اپنے محبوب اہل وعیال کو بھی مستفید کرنا چاہتا ہے۔ جس فکر ونظر کو وہ صحیح سمجھتا ہے، اس کو اپنے اعزہ واقرباء تک نہ صرف پہنچانا چاہتا ہے بلکہ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ بھی اس کو اپنالیں اور

جس سے وہ خوف کھاتا ہے اس سے ان کو بچانا چاہتا ہے۔ پروردگار کی رضا سے زیادہ پسندیدہ کون سی چیز ہوسکتی ہے؟ اس کی جنت کی جستجو سے بڑی اور کون سی جستجو ہوسکتی ہے؟ خوفِ خدا سے زیادہ کون سا ڈر ہوسکتا ہے؟ انسان کی تمنا یہی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے کہ جس ابدی خسران سے وہ بچنا چاہتا ہے، اس سے اس کے اہل وعیال بھی محفوظ رہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ دنیوی مال واسباب کے لیے جدوجہد کر کے وہ انہیں متمتع کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ دنیوی ہلاکتوں سے وہ انہیں اپنی ذاتی کوششوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ مگر اخروی خسران اور ابدی ہلاکت سے ہر شخص خود اپنی ذاتی جدوجہد ہی سے بچنے کی توقع کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے اہم مسائل اور تقاضوں کے سبب ان کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ چنانچہ بیوی اور بچے یہ نہیں جانتے کہ ابا جان کس کام میں اپنی جان کھپا رہے ہیں۔ چنانچہ آزمایش کی گھڑی میں ان کی طرف سے اخلاقی مدد نہیں ملتی۔ یا جھنجھلاہٹ اور بے نیازی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ بعض حضرات دور کے لوگوں تک پیغام حق پہنچانے میں اپنی جان کھپاتے رہ جاتے ہیں اور اپنے اہل وعیال کو بھول جاتے ہیں۔

اس سہل انگاری کو ہم نے رفتہ رفتہ اس طرح بدلتے دیکھا ہے کہ تحریک اسلامی تو دور رہی، اسلام کی دینی اور اخلاقی تعلیمات کے خلاف طرزِ عمل کو گوارا کیا جانے لگتا ہے۔ بچوں کی محبت میں، ہم میں سے اکثر لوگ ان کی دنیوی خوش حالی کی جدوجہد کے لیے وقت نکالتے ہیں اور اس کی فکر بھی کرتے ہیں۔ لیکن تحریک سے عملی وابستگی پر توجہ صرف کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ تحریک اسلامی سے وابستگی کی اہمیت بہر حال، ثانوی ہے جب کہ دینِ حق کی اخلاقی تعلیمات کی پابندی کو پروان چڑھانے سے گریز کہیں بڑا گناہ ہے۔ تقریبات میں اسراف مسلمانوں کا عام شیوہ بن گیا ہے۔ لیکن اگر تحریکی افراد بھی بچوں کی خوشی کا بہانہ بنا کر اسراف کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس سے نصب العین کی خدمت ہوتی ہے یا اس کو صدمہ پہنچتا ہے؟ شادی کے معاملے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

تُنْکَحُ الْمَرْأَۃُ لأربعٍ لِمَا لِھَا وَلِحَسَبِھَا وَلِجَمَالِھَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّیْنِ تَرِبَتْ یَدَاکَ۔ (مسلم عن ابی ھریرہ، کتاب النکاح)

عورت سے چار چیزوں کی بنیاد پر نکاح کیا جاتا ہے۔ اس کی جائداد کی وجہ سے، اس

کی خاندانی شرافت کی وجہ سے، اس کے حسن وجمال کے سبب اور اس کی دینداری کی بنیاد پر۔ تو تم دین دار عورت کو حاصل کرو۔ تمہیں خوش حالی نصیب ہو۔"

ہم غیر جانبداری سے اس امر کا جائزہ لیں کہ کیا یہی روش ہم نے اختیار کر رکھی ہے؟ آپ شاید اس تکلیف دہ صورتحال کے عینی شاہد ہوں گے کہ ہم بھی دوسروں کی طرح سب کچھ دیکھتے ہیں بجز دینداری کے۔ کیا دعوت حق اس طرح پروان چڑھ سکتی ہے؟ ہمارے بعض رفقائے سفر یہ کہتے ہیں کہ اہل خاندان کو بعض جلیل القدر انبیاء نہ بدل سکے اور وہ حضرت نوح علیہ السلام اور برادران یوسف علیہ السلام کی مثال دیتے ہیں۔ لیکن یہاں زیر بحث، انقلابِ احوال نہیں ہے، بلکہ کوشش ہے، اس امر کی کوشش کہ دین حق سے متعارف کیا جائے، تحریک اسلامی کا شعوری نصب العین واضح کیا جائے، اور ان سے محبت کا داعیہ پیدا کیا جائے۔ افسوس اس امر کا نہیں ہے کہ افراد تحریک کے خاندانوں میں تحریکی شغف کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ افسوس اس کا ہے کہ ہم کوشش اور جدوجہد سے غافل ہیں اور وہاں بھی ہم کوشش سے گریز کرتے ہیں جہاں ہم اثر ڈال سکتے ہیں۔ مثلاً غیر شادی شدہ لڑکیوں کا لباس اور ان کا طرز رہائش۔ ہم میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جہاں ہم نے اپنی لخت جگر کو ان کے حوالے کیا ہے جو دین سے بے خبر یا بے زار ہیں۔ اُس ماحول میں جانتے بوجھتے انہیں ڈالا ہے جہاں فساد کے امکانات قوی ہیں۔ مجھے آج سے تیس برس قبل کا واقعہ یاد ہے جبکہ قاہرہ کی ایک غیر رسمی دعوت میں میرا تعارف اس وقت کے معتبر اور معروف عالم دین کی تیرہ چودہ سال کی بچیوں سے کرایا گیا تھا جو منی اسکرٹ پہنے ہوئے اور کھلے بال تھیں۔ اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بالعموم اور تحریک اسلامی ہند کے بعض ایسے رفقاء کے گھروں میں بھی جنہوں نے دیارِ غیر میں قدم نہیں رکھا ہے، یہ چلن در آیا ہے تو بے ساختہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم رفتہ رفتہ کتنی دور پیچھے جا رہے ہیں۔ تحریک سے رسمی وابستگی نہ رہی، اسلامی اقدار اور اخلاق کا پاس ولحاظ تو بہت حد تک ہمارے قابو میں ہے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ معاشی خوشحالی کے لیے ہم غیر شعوری طور پر یا بالارادہ اپنے بچوں اور زیر اثر اعزہ کو ایسی تجارت اختیار کرنے سے نہیں روکتے جس میں اسلامی

حدود کی پامالی ہوتی ہے۔ اگر وہ سودی بینکوں میں ملازمت کررہے ہوں تو اس سے بھی ہم نگاہیں پھیر لیتے ہیں۔ رشوت اور جھوٹ اب ایک حد تک ناگزیر ہوگئے ہیں۔ مگر جب ایک دیندار اور داعی حق معمولی بہانوں سے ان میں مبتلا ہو جائے تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ اگر مسلمان بھی جھوٹ بولے، صحیح اور غلط حسابات رکھنے میں مضائقہ نہ سمجھے، جب وہ بھی خالص اشیاء میں ملاوٹ کرے، جب وہ بھی فریب اور خیانت پر مبنی زمین جائداد (Real state) کی تجارت کرے، تو آپ اس پر کیا کہیں گے؟

ان گزارشوں کا خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم میں اکثریت اس میں مبتلا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم پہلے جتنا ان چیزوں سے گھن کھاتے تھے، وہ کیفیت رفتہ رفتہ زائل ہوتی جارہی ہے۔ عام ملت اسلامیہ تو ان برائیوں کے لیے فقہی عذرات تلاش کرتی رہتی ہے، لیکن اگر داعیان حق بھی اس رجحان کی پرورش کرنے لگیں تو اولاد کی تربیت کیا ہو سکے گی! خاندان میں تحریک اسلامی سے شغف کس طرح پیدا ہوگا؟ تناقضِ فکر وعمل کا ازالہ ہماری دعوت کے اولین اہداف میں شامل تھا۔ کیا اب ہم اس پر مطمئن ہیں کہ اب یہ ناممکن ہے؟ سود کے متعلق ہم نے بعض معتبر رفقائے کار سے سنا ہے کہ علماء میں اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ حالانکہ دنیائے اسلام کے علماء کی دو معتبر تنظیموں (اسلامی فقہ اکیڈمی (انڈیا) اور ھیئة کبار العلماء ریاض) اور صد فیصد اسلامی ماہرین اقتصادیات، موجودہ بینک سود کو حرام سمجھتے ہیں۔ تحریک اسلامی ہند کا تو ہمیشہ یہی موقف رہا ہے۔ ایسی حالت میں فقہی جواز کے لیے کمزور رایوں پر انحصار عزیمت سے فرار نہیں ہے بلکہ اساسی تعلیمات سے گریز ہے۔

جس تحریک دعوت کے وابستگان اپنی دعوت اور اپنے مشن کو اپنے اہل وعیال اور قریبی اعزہ تک پہنچانے میں مجرمانہ غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ ان پر اپنی نشوونما کے فطری راستے بند کر دیتی ہے۔ اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ مخاطب، اعلیٰ اور ارفع اخلاق کی باتوں کو سن کر ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ داعی کی زندگی اور اس کے قریبی سماج کی زندگی پر نظر دوڑاتا ہے اور جب دونوں کے درمیان تضاد دیکھتا ہے تو نفور اختیار کرتا ہے۔ آج کا سماج تو منافقت اور دورنگی کا شاہ کار ہے۔ یہاں تو ہر شخص سچائی، دیانت داری اور حسن اخلاق کی بات کرتا ہے، مگر عمل سے مجتنب رہتا ہے۔ یہاں تو دین اور دھرم کے نام پر دکان سجانے

والے بھی اس کی حقیقی برکات سے خود کو محروم رکھتے ہیں۔ ایسے سماج میں تحریک اسلامی کے داعی بھی اگر قول و عمل کے تضاد میں مبتلا رہے تو ان کا اثر کیا ہوگا۔ برائی آج ایک طاقتور سیلاب بن چکی ہے۔ اس کا سدباب صرف ایک طاقتور جوابی سیلاب سے ہی ممکن ہے۔ یہ سیلاب اپنے اور اپنے قریب ترین سماج کے اخلاق و کردار ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

ہم نے بعض ایسے مخلص ساتھیوں کو بھی دیکھا ہے، جو تحریک سے عدم اطمینان کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ ان کے بچے بھی اس بے زاری کا غیر شعوری طور پر شکار ہو جاتے ہیں۔ اصلاح احوال اس طرح نہیں کی جا سکتی کہ آپ جس فیصلے اور جس اقدام کو اپنے فہم کے مطابق صحیح نہ سمجھتے ہوں اس کو حرز جان بنا لیں اور خیر کے تمام دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے رفتہ رفتہ اپنے رشتے کو کمزور بھی کرتے جائیں اور اپنے ہم نشینوں اور محبوب اہل و عیال کو تحریک سے بے زار کرتے جائیں۔ یہ محض اندیشے یا بدگمانی کا اظہار نہیں ہے بلکہ مجھے ذاتی طور پر ایسے واقعات کا سامنا کرنا پڑا ہے، جہاں انتہائی مخلص افراد کی اس بے احتیاطی کی وجہ سے ان کے اہل و عیال بھی بلا کسی راست معلومات کے اُنھیں تنقیدوں کو دہراتے ہیں اور بالآخر تحریک سے مخالف طرز عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ آخر اس نتیجے کی ذمّے داری کس پر ہے؟

پڑوسی کا حق:

اہل و عیال کے بعد تیسرا میدان کار ہمارے اپنے پڑوسی ہیں۔ پڑوسیوں کی خبر گیری کے جو احکام قرآن و سنت میں منقول ہیں، ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بندۂ مومن کی یہ دینی ذمہ داری ہے کہ وہ تنگی و عسرت میں پڑوسیوں کی دادرسی کے علاوہ مرض اور آفات میں، ان کا تعاون اور دستگیری کرے۔ ان کو اپنی زبان کی شرانگیزی سے محفوظ رکھے۔ ان تعلیمات میں کہیں بھی مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ حسن سلوک کا مستحق اَلْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی اور اَلْجَارِ الْجُنُبِ (النساء:۳۶) کو قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوکے پڑوسی سے بے خبری کو ایمان کے منافی قرار دیا ہے اور ایک روایت میں یہ بھی تاکید آئی ہے کہ وہ شخص مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہے، جس کی شرانگیزی سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔ (بخاری و مسلم عن ابی ہریرہ)

ظاہر ہے کہ جب دُنیوی مال ودولت میں پڑوسی کا تعاون، اس کی دستگیری، اور جسمانی تکالیف یا بیماریوں میں اس کی خدمت، ایمان کی شان قرار دی گئی ہے تو مومن کی سب سے بڑی دولت کے بارے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی منشا یہی ہوگی کہ اس سلسلے میں تعاون دست گیری اور خیر خواہی کا وہ بدرجہ اولیٰ مستحق ہے۔ وہ شعور ایمانی اور وہ فکر ونظر جس کو داعی دور دور تک پھیلانا چاہتا ہے، سب سے پہلے اس کا مستحق اس کا اپنا ہم سایہ یا پڑوسی ہوگا۔ اسلام کے اخلاقی اقدار کی پیروی مومن کا امتیازی کردار ہے۔ اس لیے کہ اسلام اعلیٰ اخلاق، سلامتی، عدل واحسان کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔

''میری بعثت اس لیے ہوئی ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔''

ظاہر ہے کہ مومن کا پڑوسی اس امر کا مستحق ہے کہ وہ ان فیوض وبرکات سے مستفید ہو، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ دین حق اس کی نعمتوں کی معراج ہے، لہٰذا اس نعمت کو ان تک پہنچانا داعی کی ترجیحات میں شامل ہے۔ اس فضا کو پروان چڑھانے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنے خطبے میں سرزنش کے انداز میں اپنے رفقاء کو مخاطب فرمایا تھا:

خطب رسول اللّٰہ ذات یوم فأثنیٰ علی طوائف من المسلمین خیرا۔ثم قال: ما بال أقوام لایفقھون جیرانھم ویأمرونھم ولایعظونھم وما بال قوم لایتعلمون من جیرانھم ولایتفقھون ولا یتعظون؟ أولأ عَاجِلَنَّھُمْ العقوبة ثم نزل۔ (طبرانی)

''ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور مسلمانوں کے بعض گروہوں کی خیر سے تعریف کی۔ پھر کہا کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو نہیں سکھاتے اور امر بالمعروف نہیں کرتے اور نہ ان کو نصیحت کرتے ہیں؟ اور لوگوں کو کیا ہوگیا کہ اپنے پڑوسیوں سے نہیں سیکھتے اور نہ تفقہ حاصل

کرتے ہیں اور نہ نصیحت (اگر تم لوگوں نے ایسا نہ کیا) تو میں جلد ہی تمہیں سزادوں گا۔"

مذکورِ بالا ارشادات پڑوسیوں کے ساتھ نہ صرف حسن اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ بلکہ ان تک دین کی دعوت پہنچانے کی بھی تعلیم دیتے ہیں اور ایسی فضا بنانا چاہتے ہیں کہ باہمی حسن سلوک، علم و تعلیم اور وعظ و نصیحت کا رواج عام ہو۔ اگر ہم اس روشنی میں اپنی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں اپنی غفلت کا شعور حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان تمام پہلوؤں سے عام ملت اسلامیہ اور تحریک اسلامی کے افراد کو اپنا احتساب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جائزہ واحتساب:

ہمیں دعوتی سرگرمیوں کے لحاظ سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم اپنے پڑوسی کو کتنی اہمیت دیتے ہیں؟ کیا ہم ان کو اپنی سرگرمیوں سے واقف کراتے ہیں؟ یا ہم اپنی پوری دعوتی قوت محض دور دراز کے علاقوں پر صرف کرتے ہیں اور اپنے ہم سایے یا پڑوسی کے انسانی حقوق سے لاتعلق رہتے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اول الذکر کا یہ حق ہے کہ وہ ہمارے نصب العین سے واقف ہو۔ اس کو یہ بات سمجھائی جائے کہ ملت اسلامیہ، خیر امت کیوں ہے اور دنیا کے ہنگاموں کے دوران اس کا فریضہ کیا ہے۔ آج کے زمانے میں یہ بھی اسے بتانا ضروری ہے کہ دین حق صرف عبادات اور چند رسوم کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ پوری زندگی کو محیط ہے اور ایک مومن کی حیثیت سے اس کی ذمے داری ہے کہ دنیا میں پھیلے ہوئے فساد کا سد باب کرنے پر اپنی توجہ مبذول کرے۔ اگر پڑوسی غیر مسلم ہے تو اس کو دین حق سے متعارف کرانا چاہیے۔ اس کو بندگی رب کی دعوت دینی چاہیے اور حکمت اور موعظہ حسنہ کے اہتمام کے ساتھ اس کو شرک اور الحاد کی ہلاکت خیزی سے واقف کرانا چاہیے۔

اس فریضے سے غفلت کی وجہ سے ہمارے غیر مسلم بھائی صدیوں سے ہمارے ساتھ رہنے کے باوجود یہ نہیں جانتے کہ قرآن کی تعلیمات کیا ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا پیغام لے کر آئے تھے۔ چنانچہ کتنی بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ چند برس پہلے جب پٹنہ

ہائی کورٹ نے دوران پابندی جماعت کے متعلق فیصلہ دیا تھا تو اس میں یہ جملہ بھی تھا کہ ’’یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتے ہیں۔‘‘ حالیہ چند برسوں میں جب جماعت اسلامی ہند نے مختلف حلقوں میں تعارف قرآن اور تعارف سیرت کی مہم چلائی تو اس دوران نہ صرف یہ کہ غیر مسلم بھائیوں کی طرف سے غیر معمولی اشتیاق کا اظہار ہوا تھا بلکہ ان کی طرف سے یہ شکایت بھی سامنے آئی تھی کہ مسلمانوں نے ہم کو کبھی کچھ نہیں بتایا۔ اس طرح پڑوسیوں سے حسن سلوک اور محبت کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ اگر پڑوسی مسلمان ہو تو اس کے حقوق کا تفصیلی ذکر قرآن وسنت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر پڑوسی غیر مسلم ہو تب بھی وہ داعی کے حسن سلوک کا مستحق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اس معاملے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے:

عن عقبہ بن عامرؓ، قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:
أول خصمين يوم القيامة جاران۔ (مشکوٰۃ)

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن جن دو آدمیوں کا مقدمہ سب سے پہلے پیش ہوگا وہ دو پڑوسی ہوں گے۔

ایک دوسری حدیث میں پڑوسی کے حقوق کی تفصیل اس طرح بتائی گئی ہے:

أتدري ماحق الجار؟

إذا استعانك أعنه وإذا استقرضك أقرضته وإذا افتقر عدت عليه وإذا مرض عدته وإذا أصابه خير هنأته وإذا اصابته مصيبة هذبته.....(إلىٰ آخر الحديث)

(عن عمرو بن شعيب عن أبيه جده۔ ترغيب وترهيب)

’’کیا تم جانتے ہو کہ پڑوسی کا کیا حق ہے؟ اگر وہ مدد کا طالب ہو تو اس کی مدد کرو، اگر وہ قرضہ مانگے تو اس کو قرضہ دو، اگر وہ فقر و فاقہ کا شکار ہو تو اس کو نفع پہنچاؤ۔ اگر وہ بیمار پڑ جائے تو اس کی عیادت کرو۔ اگر کوئی مسرت اس کو حاصل ہو تو مبارکباد دو اور اگر مصیبت میں گرفتار ہو تو صبر کی تلقین کرو‘‘.......الی آخرالحدیث)

اس طرح کی حدیثوں میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ملتی۔ بلکہ اس کے برخلاف آپ کو یہ ملے گا کہ غیر مسلم پڑوسی اگر مظلوم ہوتو اس کی دادرسی اور عمومی احسان کی روش اختیار کرو۔ غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ اگر ہم وہ رویہ اختیار کرتے جس کی ان تعلیمات میں ہدایت کی گئی ہے تو اس ملک میں نفرت اور عداوت کا وہ سیلاب نہ آسکتا جس سے آج امت محصور ہے۔ داعیان حق کو اس بات کا علم ہونا ضروری ہے کہ اس دور میں بے شمار ایسی مثال ہیں کہ محض پڑوسی مسلمان کے حسن سلوک کے نتیجے میں لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس ایسی افسوسناک مثالیں بھی ہیں کہ داعیان حق کی بے پروائی، لاتعلقی اور عام انسانوں جیسے جھگڑالو رویے کی وجہ سے غیر مسلم پڑوسی ان سے اور ان کی دعوت سے متنفر ہوئے ہیں۔

اوپر جو کچھ بھی کہا گیا ہے، اسے بے جا الزام تراشی نہ سمجھیے۔ نہ یہ سمجھیے کہ لکھنے والا ان تمام خامیوں سے خود کو مبرا سمجھتا ہے اور نہ یہ کہ ان کوتاہیوں میں خدانخواستہ تحریک اسلامی کے کارکنان کی اکثریت مبتلا ہے۔ الحمدللہ، عام امت مسلمہ میں اور تحریک اسلامی کے عام افراد میں ان تعلیمات پر عمل کرنے کا جذبہ موجود ہے، ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان اُمور پر توجہ کو ہماری ترجیحات میں اولین مقام حاصل رہے۔ وباللّٰہ التوفیق۔